

تلذش میں پھرتی رہوں گی، تمہارے ہاتھوں کی طرف دھیختی رہوں گی۔ تم ہر وقت میرے پاس تو نہیں بیٹھے رہو گے۔ مجھے خوف آتا ہے۔“
”کس سے؟“

”قست سے۔ بے گھری سے۔“ اُس نے گھل کھل بے راز آنکھوں سے اسد کی آنکھوں میں دیکھا، جیسے کہہ ربی ہو، خوشی کی تلاش سے تم سے۔“

”ان سو لہ دنوں میں تم بھی بدل گئی ہو۔“ اسد نے کہا۔

اپنی زمین پر کھڑی کھڑی کچھ اکٹھ گئی ہو، اُس نے سوچا۔ اب تم کیا چاہتی ہو ہے کیا کرو گی؟ اُس کے دل میں کسی چیز کے ملٹ ہو جانے کا درد پیدا ہوا۔ اُس کو پہلی بار۔۔۔ عجیب طور پر۔۔۔ اس بات کا احساس ہوا کہ یا سہیں عمر میں اُس سے چند سال تری ہے کہ اُس کو شاید کچھ ایسی باتوں کا علم بھی ہے جن سے وہ خود اپنی نا بلد ہے۔ اُس کا جذبہ، اُس کی حاجت، جتنی شدید ہے اُتنی خود کیفیل بھی ہو سکتی ہے۔ اُس وقت انجانے طور پر اسد کو حکیم کا خیال آیا۔

اسد کو گھانسی کا بلکا سادہ انٹھا۔ یا سہیں اُس کے سینے پر ہاتھ رکھ کر سہلانے لگی۔ اُس کی آنکھوں میں راز کے پہنچے بچھے سائیے سرناست کرتے تھے اور لب متبرسم تھے۔ اُس کی ٹھہر تی کی پرانی، ماںوس اٹھان سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ اپنی سرچ سے سکھ لائی ہے اور اب بے اذازہ سرکشی، معصومیت اور ثراۃت کی اہل ہے۔ اُس کا چہرہ یکسر بدل چکا تھا۔

”تم مجھے کہاں لے کر جاؤ گے؟“ اُس نے پوچھا۔

”جہاں تم چاہو۔ گاؤں میں چھاپا کا گھر ہے۔ شہر میں میرا اپنا گھر بھی ہے جو نہد پڑا ہے۔ اُس میں رہ سکتے ہیں۔ یا اُسے پسچ کر کہیں اور جا سکتے ہیں۔“

”پسچ دے گے؟“

”لہاں۔ یہیں اُس کا ماںک ہوں۔“

”نہیں۔ میرا مرطلب ہے تمہارا دل چاہتا ہے اُسے پیچنے کو ہے۔“

”کبھیں نہیں۔ چھاچا سکتا ہے۔“

یا سہیں جیرت سے اُسے دکھیلتی رہی۔ ”تمہارا دل نہیں کرنا دیاں جا کر رہنے کو ہے۔“

”کوئی خاص نہیں کرنا۔ اس نے کہا۔“ اگر تم چاہو تو اسے پسچ کر کہیں اور چندے جائیں گے، کسی بڑے

شہر میں مجھے ملازمت مل سکتی ہے۔

”کہاں پڑھے؟“

”کہیں پڑھجی۔“

”تم ملازمت کرنا چاہتے ہوئے؟“

اسد نے کہا ہے اچکائے۔

”اسد،“ یاسین نے پوچھا، ”تم کیا کرنا چاہتے ہوئے؟“

”کیا مطلب کیا کرنا چاہتا ہوں؟“

”کوئی ایسا کام جو تمہارا بھی چاہتا ہے کرنے کو۔“

”ہاں۔“ اسد نے سوچ کر جواب دیا، اخبار میں کام کرنا چاہتا ہوں۔ یا کسی رسالے کے

دفتر میں۔“

”تمہیں ایسا کام مل جائے گا؟“

”کر شش کروں تو مل سکتا ہے۔“

اسد کو پھر کھانی کا دورہ آئھا۔ وہ کھانے کھانتے اٹھ کر پیچھے گیا۔ یاسین اُس کی پشت پر تھیلی مارے ہوئے کان لگا کر اُس کی چھاتی کی آواز سننے لگی۔ کھانی کے اندر بھار می رینگتے ہوئے سانس کی آواز آئی۔ سانس برابر کر کے اسد پھر پشت پر لبیٹ گیا۔

”قیض پہن لو۔“ یاسین نے کہا، ”سردی گھب جائے گی۔“

اسد نے کندھوں کو ایک اپریل سی خبیث دی۔

”پہن لو، اسدی۔ ہربات پر صد کرتے ہو۔“

اُس نے قیض یا سین سے لے کر پہن لی۔

”سانس کیسا رہا تھا ہے؟“ یاسین نے پوچھا۔

”ٹھیک ہی رہا۔ صرف ایک بار دورہ ہوا۔“ اسد نے کہا، ”حالانکہ دو اگلے ایک خودا کی بھی نہیں کھائی۔“

”اچھا ہے۔“ یاسین سرتست سے بولی۔

”آگے کیا ہوگا، اس کا کچھ پتا نہیں۔“

”آگے بھی صحیک رہے گا۔“

”کیسے ہے؟“

یاسین ٹھنڈک کر اسے دیکھنے لگی۔ بات اُس نے خیال کیے بغیر، اپنی صرت کے میلے میں کر دی تھی۔
”کیسے صحیک ہے گا؟“ اسد نے پوچھا، ”دوا ہے؟“

یاسین کی لمحتے تک اُسے کھلی کھلی آنھوں سے دیکھتی رہی۔ پھر بولی، ”میں پیار نکلی ہیں۔“

”مطلب ہے؟“

”ہاں۔ میں نے ساری الماری چھان ماری ہے۔ گھر میں تلاش کیا ہے۔ صرف جیسیں ملی ہیں۔“
تمن بختے کی خداک، اسد نے سوچا۔ ”تمہیں کچھ پتا ہے اس کے بارے میں؟“ اُس نے پوچھا۔

”بُوئی کا پتا ہے۔“

”کیا نام ہے؟“

”نام کا مجھے علم نہیں۔ مگر پہچان ہے۔“

”پہچان؟“ وہ بولا، ”پہچان سے کیا ہوتا ہے۔“

”کافی پہنچ سکتی ہوں، صاف۔“ یاسین نے کہا۔

”اور بھی کچھ پتا ہے؟“

”ایک دو چیزیں اور پوتی ہیں۔ مگر جیاں تک میرا خیال ہے دیے ہی ڈال دی جاتی ہیں۔“

”دیے ہی کیسے ڈال دی جاتی ہیں؟“

”کچھ بے ضرری چیزیں یعنی تک، سودا، مصری، فوشاد دغیرہ ہر ایک دو میں تھوڑی بہت ملائی جاتی ہیں۔ مگر اب تک دو اُس میں صرف ایک ہی جز ہوتا ہے جو محل چیز ہوتی ہے۔“

”دوسری چیزیں کیوں بلائی جاتی ہیں؟“

یاسین ایک لمحے تک سوچتی رہی۔ ”پتا نہیں، اسد۔ مجھے ان باقاعدہ کا پورا علم نہیں۔ ہو سکتا ہے کچھ دو اُن پر پسانی کا اثر پتا ہو، کچھ میں نہ پتا ہو۔ مگر ایک بُوئی کا مجھے علم ہے جو اس کا شفائی جز ہے۔“

”بُوئی ہے؟“

یاسین نے خاموشی سے فتحی میں سر ٹالایا۔

”نئی کتب آئے گی؟“

یا سہیں پھٹی پھٹی آنکھوں سے اُس کی طرف بھیختی رہی۔ ”خوشیِ محمد لانا تھا۔“ وہ بولی۔
”کہاں سے ہے؟“

”سرحد پار سے ہے؟“
”ادھر نہیں ہوتی ہے؟“
”نہیں؟“

”کہاں پر ہوتی ہے؟“ اُس نے پوچھا، ”کیسے منگوتا تھا؟“
”پتا نہیں۔ شاید خود جایا کرتا تھا۔ اور اُس کا تعلق تھا۔“

”کس سے پتا چلے گا ہے کوئی اور بھی لا کر دیا کرتا تھا؟“

”پہلے ایک دو اور لوگ تھے اب اکے جانتے والے وہ بھی لا یا کرتے تھے۔ اب ایک حصے سے یہی تھا، اُسے درد کا اچھوڑا گا،“ جس سے اب اس کا کام چلتا تھا۔“

”اب کیا ہے؟“ اسد نے پوچھا۔

یا سہیں پھٹی پھٹی نظروں سے اسد کو دیکھ رہی تھی۔ سمجھت اُس نے آنکھوں کو ما تھے سے ڈھانپ لیا اور اسد کے یہ نے پر ما تھار کھ کر رونے لگی۔



جب شاہ رُخ آیا تو خوشیِ محمد کی گرفتاری کا معتر اسد کے دل سے اُتر چکا تھا۔ اب مُشکِ دوا کا تھا۔
”خوشیِ محمد سے تمہاری واقعیت تھی؟“ اُس نے پوچھا۔
”اسی حد تک کہ کچھ دیر اُس نے میرے پاس کام کیا تھا؟“
”سرحد پار سے اُس کا تعلق کس سے تھا؟“
”مُٹا تھا اُس کی رشتہ داری ہے۔ اُس وقت بھی جب میرے پاس کام کرتا تھا جاتا آماز ہتا تھا۔ کیوں؟“

"میری دو اگلی بُولی ادھر سے آتی تھی" : اسد نے کہا۔

"خوشی محمد لایا کرتا تھا ہے"

"اپنے حکیم کی ساری بُولیاں دغیرہ اب وہی سپلانی کرتا تھا"

دو نوں کچھ دیر خاموش میٹھے رہے۔

"اُس سے بات کرنے کی کوئی صورت ہو سکتی ہے؟"

شادہ رُخ اور پرکا ہرنٹ دانتوں پر کھینچ کر اپنی چھوٹی چھوٹی سنہری موچھیں چڑانے لگا۔

"مشکل ہے" وہ سوچتے ہوئے بولا۔

"کوئی صورت تو نکالنی پڑے گی" کچھ دیر بعد اسد نے کہا، ان دنوں تو میری قسمت کام کر رہی ہے۔

مگر کب تک؟

"یا سہیں کچھ علم ہے؟"

"صرف پہچان ہے۔ نام سے واقفیت نہیں"۔

جب یا سہیں قہرے کے پایا لے اٹھائے کمرے میں داخل ہوئی تو شادہ رُخ نے اُس سے مخاطب ہو کر پوچھا: "کچھ خبر ہے یہ بُولی کس علاقے سے آتی ہے؟"

"خاص علاقے کا بچھے علم نہیں۔ مگر کہیں قریب ہی اگتی ہے"

"کیسے؟"

"جب یہاں پہنچتی ہے تو اوہ گیلی سی ہوتی ہے۔ دو چار روز پھیلا کر سکھانی پڑتی ہے"۔

"وہ تو خیر تھیں روز بھی لے کر چلتے رہو تو گیلی ہی رہے گی"۔ شادہ رُخ نے کہا۔

"مگر لینے والے بُولی ہی لینے تو نہیں جاتے" یا سہیں بولی، آرام سے آتے جاتے ہیں۔ تمہیں پتا ہی ہے"

شادہ رُخ سرپرخ میں پڑ گیا۔ یا سہیں لے اسد کو دیکھا۔ اسد قہروہ پتیتے ہوئے ہلکی ہلکی آواز پیدا کر رہا تھا۔ اس

کے باختہ میں بے معلوم سا ارتعاش تھا جسے صرف یا سہیں نے محسوس کیا۔ نیز دیر خاموش میٹھے الائچی دار گرم قہروہ پتیتے

رہے۔ خوشی محمد، اسد نے سوچا۔ خوشی محمد تک رسائی کیسے ہو گئی یہ بُولی کہاں اگتی ہے۔ — — —

وہ جگہیں جو انکھوں نے نہیں دیکھیں!

"اچھا"۔ شادہ رُخ کچھ دیر اور پاتیں کرنے کے بعد آٹھ کھڑا ہوا۔

"کھانا کھا کر جانا" یا سہیں نے کہا۔

” نہیں، اب میں چلتا ہوں ” شاہزادہ امتحان برحتے ہوئے بولا، ” کوشش کرنا ہوں، دیکھو شاید پہنچ کام بن جائے ۔ ”

اس نے اسے ماتھہ ملا کر چار پاؤں کی پانچتی سے اپنی رائفل اٹھاٹی اور باہر نکل گیا۔ چھوٹی سی نیچی پانچی پر تھوڑے کتے ہیں خالی پیالے پڑے تھے۔ سید صینی کے پایلوں میں لیپ کی میاں جملداری تھیں۔ باہر انہیں سیری راست میں اس نے سر کر لیکے بکھر لیے دیے، جیسے اُس کی انگوں کے آگے کرنی جانا آگیا ہو۔ جب سے وہ واپس آیا تھا اُس کا دماغ روکے نہیں ملتا تھا۔ رذاخ کرتی ہوئی اوازیں، کوئی دُکونی بات، آوھے پونے چمٹے، گرد ڈمناظر، لفڑی پنجے لپنی بول چاں میں صرف، روان دوان رہتے تھے۔ جب سے اُسے دلت کے گفتے سے بخل جانے کا احساس ہوا تھا، اُس کا دماغ اپنے کاردن سے اہر اگر بہنے لگا تھا۔ بھی کبھی وہ سے جب پیٹ میں گہرے بخوبی ڈالنے لگتے تو وہ ذہن کی اس منہ زوری پر جھنگلا اٹھتا۔ مگر اسے روکنا اُس کے بس کا کام نہ تھا۔

” شاہزادہ کے کئی ادمی ادھر جاتے ہوں گے۔ کسی نکسی سے کام نکل آئے گا ” یا سین نے کہا۔ وقت کا مسئلہ ہے، اُس نے کہنا چاہا، اتنا وقت کہاں سے آئے ہے گر کہتے کہتے رُک گیا۔ یا سین کی خود میں ایک بات تھی، گشیدیں رُکنا ایک دوسرا معاملہ تھا۔ معاملہ کیا تھا؟ خود اپنے سوال کے اور پر اس نے ذہن کو رکز کرنا چاہا۔ مگر اس کی سوچ کا تاریث رہا تھا۔ پولیس کا خوف ہے اگر صرف اپنی حد تک اسے پہنیں کی دست اندازی کا خذشہ ہوتا تو کوئی بات نہ تھی۔ پولیس کا وجود ایک سبب ہے شکل پیرے کی مانند اس کے دماغ پر فائدہ ملتا مگر اس کے دل سے اڑ چکا تھا۔ مگر یا سین؟ یا سین کو وہ اس درست کی شکل کیسے دکھائے؟

سے وقت کی تنگی کا دباؤ بہر جانب سے بڑھا اور رہا تھا۔ جیسے کہ لی چین چھٹی جا رہی ہو۔ کوئی کنارا، کوئی صد ناصل۔ ذوالقدر نے کہا تھا: ” زیادہ سے زیادہ دن بھر کے پھیرے کی اجازت مل رہی تھی۔ یہ نے اپنی ذات خصانت پر یعنی روز کی بہت حمل کی ہے۔ گاؤں میں یا ادھر ادھر مطلب وغیرہ میں آئے جانے کی ضرورت نہیں۔ مگر پر ارام کرنا۔ تمہیں آرام کی ضرورت ہے۔ مجھے لیٹ ڈاؤں مت کرنا ” اس کے آخری الفاظ گود خواست کی صورت تھے مگر لہجہ مختلف تھا۔ ان کا مطلب اسے پر واضح ہو گیا تھا۔ ذوالقدر کی طاقت سے وہ نادانست تھا مگر اسے ایک احساس تھا کہ ذوالقدر کا اختیار سردر میں تیرے ہوئے برقائی تروے کی مانند ہے جس کا ایک حصہ رکھا ہی دیتا ہے اور ذہن سے نظر سے اوچھل ہوتے ہیں۔ یا سین کو کیسے بتاؤ؟ اس نے سچا۔

یا سین خالی پیالے اٹھاتے رک گئی۔ اس نے پیالے ملدہ سے رکھ دیے اور لا لین اٹھا کر

کمرے کے اس کونے کی جانب بڑھی جہاں پر فرش سیشے کی طرح صاف رہتا تھا اور موٹی ملکل پچا کر اور مختلف قسم کی بویاں سوکھنے کے واسطے پھیلا دی جاتی تھیں۔ ملکل کامکرا اب دہاں سے انہوچ کا تھا مگر فرش اسی طرح بے گرد تھا اور چند ایک نئے نئے خشک پتے اور ادھر اور بھرے پڑے تھے۔ یاسیمن نے پاؤں کے بل پیچہ کر احتیاط سے سارے پتوں کو ایک ہاتھ سے سینٹ کر انہایا، پھر دیواروں کے سامنے سا تھا اور کونے میں لاٹیں گھما کر فرش پر درد ایک مزید پتے پھنسے اور تھیلی پھیلا کر لاٹیں کی روشنی میں ان کا معانہ کرنے لگی۔

اس کے پاس جا کھڑا ہوا۔ پچھے ملا ہے اس نے پوچھا۔

یاسیمن چہرہ ہاتھ کے قریب سے جا کر، پتوں کو کرید کر پکڑ کر دیکھتی رہی۔ پھر اس نے مسہ اور پرانا یا اور کچھ بولے بغیر، نصی میں سر ہلا کر، انہوں کھڑی ہوئی۔ اس اگر چار پائی پر بیٹھ گیا۔

"مجھے اس کی شکل یاد ہے۔" یاسیمن اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر بولی، "اس وقت بھی میری انکھوں کے سامنے گھوم رہی ہے۔ انہیں بند کر کے اے ٹریس کر سکتی ہوں۔ اسے حمل کرنے میں کوئی وقت نہیں ہوگی۔ کئی لوگ آتے جاتے رہتے ہیں۔ شاہزادخ —"

یہ بات بھی نہیں، اس نے سوچا۔ بڑی مل گئی تو پھر ہے پھر کیا ہو گا ہے فقط افاقت کی ایک صورت — ایک مہلت پچھے طویل ہو جائے گی۔ پھر ہے

جس چیز کو وہ عام فہم نہ گی سمجھ کر دن گزارنے کا عادی ہو چلا تھا، ان سولہ دنوں نے اسے بدل کر کھڑا یا تھا۔ اس نے زندگی کی ایک ایسی شکل دیکھ ل تھی کہ اب اس کی اور پری صورت میں قابل قبول نہیں رہی تھیں۔ ہاں، اس نے دبایہ سوچا، افاقت کی ایک صورت — مگر اس کے پیچے، اس کے عقب میں، اس کا پھیلا دیا ہے، اس کی جڑیں ہیں، جہاں سے وقت کی تنگی پھوٹتی ہے۔ اس روز مرہ کی تنگی کر میں نے اتنی غریب سہارا دیے رکھا ہے، اس لیے کہ اس کے پیچے جنا معلوم حقیقت تھی اس کی دہشت مجھ پر سوار رہی ہے۔ اب دہشت کی شکل میں نے دیکھ لی ہے۔

"ہفتے دس دن کی بات ہے۔" یاسیمن اس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے کہے جا رہی تھی، "کوئی نہ کوئی لے آئے گا۔ دیکھیں شاہزادخ کل کیا خبر لاتا ہے۔ تم کہیں مت جانا، اسدی کسی سے پوچھنے پا پھنسے کی ضرورت نہیں تھیں یہاں بننے سے کوئی روک نہیں سکتا۔ میں اس گاؤں کی اولاد ہوں۔"

"مگر میں کیا ہوں ہے اس نے اپاچاک پوچھا، میری یہاں پر کیا حیثیت ہے؟"

یاسیمن اس کا منہ تکنے لگی۔ "تم —" وہ کچھ کہنے لگی، پھر چپ پ ہو کر اسے دیکھتی رہی۔ اس کا چہرہ

سترن ہو گیا۔

”ایسے کام نہیں بنئے گا۔“ اسد نے آہت سے کہا، کچھ نہ کچھ سوچنا ہی پڑے گا۔“
 مگر سپرخ کا تار بڑتا جا رہا تھا۔ وہ رات بھر دنئے رفتے سے جا گئتا رہا۔ جب اس کی فینہ کھلتی تو بیداری کے
 ساتھ ہی اسے یہ بات یاد آ جاتی، جیسے اس کے پہرے پر کھڑی ہوئی ہو اور دھک سے اس کا دل خالی ہو جاتا،
 جیسے کوئی نقشان یاد آ جائے جس ب اس کو زین دن کی اجابت مل تھی تو اسے محسوس ہوا تھا جیسے دنیا بھر کی
 آزادی مل گئی ہو۔ اس وقت اپنے دل میں صرف ایک بھی راستہ اسے دکھائی دیتا تھا: گشہ! اس سے
 آگے کویا سپرخ کا وجود ہی نہ تھا، کہ جیسے دہان پہنچ کر زندگی ختم ہو جائے گی یا پھر شروع ہے روان ہرگز گشہ
 اس کے زندگی نہ ختم ہوئی۔ شروع مگر اس کی شکل کچھ ایسی بدلتی ہوئی کہ پہلی شکل یاد میں بھی نہ کئے گئی، جیسے کبھی
 تھی ہی نہیں۔ یاسین کی ملکی چیلکی تصویر جو اتنے عرصے تک اس کے اندر ایک ایک نقطے کو چھوٹی ہوئی پر واڑ کرتی
 رہی تھی، جس نے ایک بے نام سے نیم روشن خوبی کی صورت اس کی جان کی شکل ترین وقت میں سنبھالے رکھا تھا،
 وہ تصویر اب زندہ ہو گئی تھی۔ اس تصویر نے ایک جنم، ایک جنم اور ایک جنم اختیار کیا تھی۔ اب وہ ایک
 ماتھی میں نہ آئے والی شہزادہ رہی تھی بلکہ ایک بدن تھا، اور وہ بدن اس کے بدن میں شامل تھا۔ اب جب کہ دو
 روز کر چکے تھے اور وہ یاسین کے ساتھ لیا اس رات کے ایک ایک لمحے پر اتھر کھرا تھا تو اس پر اس
 آزادی کی حقیقت کھل چکی تھی۔ کہ یہ آزادی محض ایک اور مہلت تھی، وقت روکے نہیں مُرکّتا تھا اور اس کا
 جسم بوٹی بوٹی کر کے سرد ہوتا جا رہا تھا، جیسے جان نسل رہی ہو۔ اسہ پر اب پہلی بار بدن کی حیثیت کا انکشاف ہو
 رہا تھا۔

صحیح سویرے جب وہ اٹھا تو اس کا دل اسی طرح بے چین تھا۔ وقت تیزی سے گزرا جا رہا تھا اور اب
 تک اس کے سامنے کوئی راستہ نہ ریا تھا۔ جوں جوں دن ڈھیننا جا رہا تھا گشہ میں رہنے کا خیال اس کے دل کے
 قریب اور دریاغ سے دور ہوتا جا رہا تھا۔ دو پھر ڈھنے ڈھنے گشہ سے چلے جانے کا امکان اس کے خیال میں
 جنم لینے لگا۔ یاسین اٹھتی بیٹھتی بے صبری سے، بے خیال سے اور بے جگہی سے اس کے دہنے پر اصرار
 کرتی رہی۔ مگر بہت آہتہ آہتہ، جیسے جیسے دھوپ سرکتی گئی، اس کے دل میں یہ احساس پکا ہوتا گیا کہ جلد یاد رکھ
 ہا لآخر سے گشہ کو چھوٹنا پڑے گا۔ شام سے ذرا پہلے شاہ رخ آپنچا۔ اس نے الہام دی کہ خوشی مختصر کے سرحد پار
 کے تعلق کا پتا نہیں چل سکا۔“ اس کے بھائی برادری کے لوگ میرے پس کام کرتے ہیں۔ اس کا چھاڑا دیمیر گارڈ
 ہے۔ میں نے اس سے کہا ہے کہ آج کل ہی خوشی کے گھر جا کر پناکرے۔ پہلے میرا خیال تھا میں خود جاؤں۔ پھر

سرچاک مر جاماً تھیک نہیں۔ خاص طور پر آج کل ۔ ۔ ۔

”اس کے بیوی نے کچے پیس ہے اس نے پوچھا۔

”ہاں۔ سنا ہے سو برس سے اور پر اس کے باپ کی عمر ہے۔“

”یہ اس کے بھائی بند دہی ہیں جنہوں نے اس کی مخبری کی تھی ہے“ اس نے پوچھا۔

شاد رُخ نے چونک کر اس سے دیکھا۔ اس سے اس وقت اس نے اس سوال کی ترقی نہ تھی۔ ”ہاں۔“ اس نے

کہا۔

پوچھو دیز نک وہ بیٹھے ادھر ادھر کی باتیں کرتے رہے۔ جب شاد رُخ رخصت ہرنے لگا تو اس کے ساتھ پل ٹپا۔ ”شاد رُخ کو چھوڑ کے الجھی آتا ہوں۔“ وہ بولا۔

”کہاں جا رہے ہو ہے یا سماں نے دہل کر پوچھا۔

”یہیں تک۔“ اس نے ہاتھ سے باہر کی جانب اشارہ کیا اور شاد رُخ کے ہمراہ دروازے سے نکل گیا۔

وہ پہلی بار گھر سے نکلا تھا۔ اس نے ایک سرسری نظر مطب پڑالی۔ مطب سنان ٹپا تھا۔ راستے میں انہیں گھر لوٹنے ہوئے چند کسان ملے جنہوں نے شاد رُخ سے سلام و عالی۔ ان میں سے صرف ایک نے نظر بھر کر اس کو دیکھا، باقیوں نے انہم کو بھی نہ ملائی۔ انہیں اس کے گاؤں میں وار و ہرنے کا علم ہو چکا تھا۔ اس نے یہ سوچ کر اپنے آپ کو تسلی دی کہ اس کی ان چاروں سے کوئی خاص و اتفیقت نہیں تھی، کروہ جانا تھا کہ گاؤں میں ہر کسی سے مخالف ہو کر حال احوال پوچھا معمول کی بات ہے۔ اسے خیال آیا کہ اس کا کوئی خاص جانے والا، احمد یا علی مطب کا کوئی پُرانا ساتھی دیر جس نہیں۔ سلسلے سے آتا ہر اعلیٰ یا تراں کا روپ کیا ہو گا ہے، دیوار کے ساتھ خاموشی سے کھیلتے ہوئے چند بچے اپنا چیل رد کر بغور اسے دیکھنے لگے، جیسے وہ کوئی سمجھو رہے ہو، اور اس وقت تک دیکھتے رہے جب تک کہ وہ ان کے پاس سے گزر نہ گیا۔

”ایک رُکا ہمارے ساتھ مطب میں ہوا کرنا تھا،“ اس نے بات کی۔ ”میر جس۔“

”ہاں تپ دق کا ملیض۔“ شاد رُخ نے کہا، ”میں جانتا ہوں اسے۔“

”آج کل ادھر رہی ہے ہے“ اس نے سرسری آواز میں پوچھا۔

”خبر نہیں۔ اس کا چھپا سیرے پاس کام کرتا ہے۔ کیوں، کوئی کام ہے؟“

”نہیں۔ ویسے بھی پوچھا ہے۔“

درختوں کے ذفیر سے کے کنارے پر اس نے شاد رُخ کو الوداع کیا۔ جب شاد رُخ راستے کی دھلان

پڑا تک نظر دیں سے او جھل ہو گیا تو اسد نے مژکر گاؤں پر ایک نظر ڈالی۔ شام گہری ہوتی جا رہی تھی۔ آسمان سے رات کا سایہ گاؤں کی دیواروں پر آتے لگا تھا۔ گاؤں بھر میں روشنی کی رنگ دکھائی دیتی تھی۔ نہ کوئی آواز تھی نہ حرکت۔ ستارے نہایت خاموشی سے ایک ایک کر کے نکلتے آ رہے تھے۔ یہ شام کا وہ یکساں وقت تھا جب فضائل کا وجود ایک لمحے کو ٹھہر جاتا ہے اور اس کے عغرب بھی صل ہو جاتے ہیں۔ اس وقت دہان کھڑے کھڑے، اس سنسان اور ساکت منظر کو دیکھتے ہوئے دفعہ اسد کے ذہن کا نقشہ بدلتے لگا۔ اس نے محسوس کیا جیسے وہ اب اس گاؤں سے چل دیا ہے، جیسے اب واپس جانے کا کوئی راستہ نہیں۔ اپنے دل میں کہیں اسے یہ شک تھا کہ یہ اس حکس صحیح نہیں ہے، مگر وہ جانتا تھا کہ اس کے مقابل وہ لامد ہے۔ یہ احکام ایک ایسی خبر کے اتنے تھا جس کی لمحہ دہ ایک ہوئے سے متوقع رہا ہو۔ جھپٹے کے اس بے عنصر وقت نے یہ خبر جادو کی طرح اس کے وجود میں پھیلادی اسے اس کے قدم روٹ کر جانے کے بھائے دہیں کے دہیں جسے رہے۔ پچھلے دیتک دہ اپنے جسم کے خلا رہیں پہاڑیاں دہیں پہاڑیاں کھڑا اس ہماریک گاؤں کو دیکھا رہا۔ اس کا دل مر جھاگیا۔ اس نے اپنے پہاڑی بھاری سویٹر کی چیزوں میں ڈالے اور سر جھکا کر ایک طرف کر چل پڑا۔

وہ اس راستے پر چل رہا تھا جو گاؤں کی حد کے ساتھ ساتھ اور پر کو جاتا تھا۔ تھوڑی دیر میں باہر پہنچا ہوا، رہ گاؤں سے ڈر نکل گیا۔ یہ راستہ ایک ڈریو کو سننکر چڑھائی کا تھا، پھر دھلان پر جاتا تھا۔ اب انہیں ہو چکا تھا اور اس کی سانس بچھوٹ گئی تھی۔ پہاڑ کی سرد ہوا اس کے بالوں میں سے گزر رہی تھی۔ وہ ایک موٹی سی کوٹ نما سویٹر پہنے ہوئے تھا جس کے مبنی کھلے تھے۔ اس کا بدن چڑھائی پر چلنے کی وجہ سے گرم ہو گیا تھا مگر پچھلے چند منٹ سے اس کو پہنے ہیں گرانی محسوس ہونے لگی تھی۔ وہ نگلیوں سے پہنے کے بالائی حصے کو آہستہ آہستہ ملنے لگا۔ گل ان کم ہر ہر فی۔ ایک چکر پر رک کر اس نے پہنے آگے نظر دوڑا۔ اب وہ اس راستے پر انکھا تھا جو گاؤں کی عقبی پہاڑی کو کامٹا ہوا چڑھتا تھا۔ وہ جا کر راستے کے کنارے پہنے ہوئے ایک پھر پہنچ گیا۔

وقت اب اس کے حلن میں تھا اور شگ ہوتا جا رہا تھا۔ اس کے اندر چھوٹی بڑی چیزوں کی جگہ ڈھپی تھی انہوں کی طرح دل پر خود کرنے والی دہشت، جیسے کوئی پیچھے لگا ہے، کون زانہ میں انجائے یعنی کیے آتا ہے۔ تراخ تراخ۔ بیسے پیچھے اور نظر کے ہاپر دہشت کا پڑا ہے۔ وہ نگلیوں کے پورے دل سے ہوئے ہوئے اپنے حلن کے دام کو کھو دیا رہا، جیسے سانس کی جزوں کی پہنچا چاہتا ہو۔ ستارے اب پوری چک سے نکل آئے تھے۔ ایک رکا گرد ہے پر نکڑیاں اور پائی کا ایک مٹکا لادے سائے کی انہر راستے سے گزر گیا۔ یہ دو کامباں جا رہا ہے، اس نے حیرت سے سر جا رات کے انہیہے میں راستہ چلتے ہو گئے ہیں، رات سرد ہوتی جا رہی تھی۔ آسمان پر اب پا دلوں کے

اکاڈمیک بے نووار ہو کر ستاروں کوڑا چکنے لگے تھے۔ دیر زمک وہ دہان پیشجا چاروں طرف سے اندھیرے کی یونیورسٹی کی دیکھنا رہا۔ آہتہ آہتہ، اس کے اندر کی آگ دھیجی پڑنے لگی۔

آفراس تاریک چمن پر، سرک کے گزارے بنیخے میٹھے، دفتہِ اسد پر اپنی صورتِ حال کی حقیقت کھلی۔ اس وقت گویا رات کا ایک لمحہ ہیرے کی مانند منجمد ہو کر چمک آئتا، اور اس لحظے کی چکا چوند میں اسد نے دیکھا کہ یاسین اس کے ساتھ لگکر کھڑی اس کے کندھے پر اتھر کھے کہہ رہی ہے؛ تم کہیں مت جانا، اسدی کوئی تمہیں کچھ نہیں کہہ سکتا۔ یا یاسین کی آنکھوں میں سرکشی اور معصومیت ملتی۔ یہ ایسی آنکھیں تھیں جنہیں نہ مہت کی شکل نہیں دیکھی تھی۔ اس وقت اسد کو علم ہوا کہ اور کہیں کچھ بھی نہیں ہے، نہ وقت ہے نہ وقت کی یونیورسٹی ہے اسی شکر ہے اندھہ کوئی دوا۔ دنیا یہیں بس یاسین کا چہرہ ہے، اور کسی شے کی حقیقت نہیں۔ سب چھوٹی بڑی باتوں کے لشکر اس ایک بات سے پھوٹتے ہیں۔ وہ لشکر اب غائب ہو چکے تھے۔ اب اس کے دل پر صرف ایک خوف کا سایہ تھا، کہ ایک بار اگر وہ یہاں سے اس طرح بے نام چلا گیا تو پھر کبھی یاسین کوڑا دیکھ پائے گا۔ اس خیال سے کہ وہ یاسین سے جدا کر دیا جائے گا اس کے بدن کی طاقتِ زائل ہونے لگی۔ اسے محسوس ہوا کہ اس کی ٹمباں پانی ہو رہی ہیں۔ بسردی اس کے پاؤں کو چڑھنے لگی۔ جنت کر کے وہ آئھ کھڑا ہوا۔ اس نے سویں مرکے گول گول بیاہ میں بندیکے اور اتھر بغلوں میں کر پلٹا۔ اب اس کے سامنے ایک ہی راستہ تھا — ذوالفقار کا گھر۔

وہ اپنی پراہنے گشادے ہو کر گزرنے کی ضرورت پہنیں نہ آئی۔ راستہ کا دن سے چار سو گز کے فاصلے پر گز رہا ہوا سیدھا نیچے کو جانا تھا۔ اسد کے سر میں اڑان تھی۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے زمین اس کے قدموں کے استقبال کے والٹے آئھ کر آ رہی ہے۔ اسد کو وقت کا حکس نہ ہوا، گرد سے چلتے چلتے گھنٹہ بھر ہونے کا آیا تھا۔ ذوالفقار رات کے اس وقت اسے دیکھ کر حیران رہ گیا۔

پچھے دیر بعد اسد اسی بتر پر، جہاں اس نے استراحت کے چند روز گزارے تھے، پیشجا تھا۔ ذوالفقار نے اس کی آمد سے فراہی پہلے کھانا کھیا تھا۔ اس نے اسد سے کھنے کو پوچھا۔ اسد کو ہجوبک لگکر رہی تھی۔ چند منٹ میں ذوالفقار کا ملازم اس کے لیے روٹی اور شورپ لے آیا۔ جب اس نے کھانا شروع کیا تو ذوالفقار نے سگریٹ سلگا کی اور کرسی کی پشت سے بیک لٹکا کر پیٹھ گیا۔ گو اسد دعوے کے مطابق گشادے پر پٹ آیا تھا مگر ذوالفقار کے چہرے سے ظاہر ہوتا تھا کہ اسد کو دیکھ کر اسے کوئی خوشی نہیں ہوئی، جیسے کہ وہ اسد کو اپ اپنے ہاں دیکھنا چاہتا ہو۔ وہ کرسی پیٹھا مسلسل اسد کو کھانا کھاتے، نوالہ چباتے، نگلختے اور وہ سرانواز مثہ میں ڈالتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔ اس کی نظروں میں عدم اعتماد کا تاثر تھا۔

وَالْمِسْجَدِ وَالْقَعْدَةِ وَالْقَعْدَةِ لَهُ مُؤْمِنٌ

اسد نے اختیاط سے اپنے مرنگ کا نواہ چاہا کر نکلا۔ پھر اس نے پانی کے ایک گھونٹ سے حلی صاف کیا اور بولا: ”ایک بات کرنے آیا ہوں“؛ ذوالفقار نے مختصرًا ”ہوں“ کی اواز نکالی جیسے کہہ رہا ہو: ”کرو۔ میں سن سما ہوں۔“

اسد آہستہ آہستہ اگلاؤں رچانے لگا، جیسے بات کو نلاش کر رہا ہو۔ آخر نواہِ ختم کر کے وہ بولا: ”آپ نے بھے کیک بات کی تھی۔“ ذوالفقار خاموشی سے اس کی طرف متوجہ رہا۔

”اگر میں،“ اسد نے جھکتے ہوئے بات شروع کی، ”آپ کی پیش کش قبول کر لوں — تو گندہ میں رہ سکتا ہوں؟“

”وہاں کیا کر دے گے؟“

”یا سہیں کے کام،“ اسد نے جواب دیا، ”ختم ہونے میں کچھ وقت لگے گا۔“

ذوالفقار نے اس طرح اسد کو دیکھا جیسے پوچھ رہا ہو: ”کون سے کام ہے اسد خاموش رہا۔

”میری پیش کش قبول کر کے تم گندہ میں کیسے رہ سکتے ہو؟“ ذوالفقار نے پوچھا۔

اسد نے فراز چاہتے چاہتے نقی میں سرملایا: ”ابھی نہیں، وہ بولا،“ واپس آگئا۔

ذوالفقار چند لمحوں تک سوچ بھری نظر دی سے اسے دیکھا رہا، جیسے اسد کی بات کو ذہن شین کر رہا ہو۔ ”میں کسی قسم کا وعدہ نہیں کر سکتا۔“ پھر وہ بولا، پولیس کی کارروائی میں بڑا راست داخلت کرنا ہماری بالسی نہیں۔ میں نے تم سے بات خلوصِ نیت سے کی تھی۔ آتا بنا سکتا ہوں کہ اگر تم رضا منہ ہو جاؤ تو اس میں تمہارا فائدہ ہی ہو گا۔ میں صرف یہی وعدہ کر سکتا ہوں کہ حتیٰ المقدور تمہاری مدد کروں گا۔“

اسد آہستہ آہستہ روٹی کے ذلیل شربے میں ڈبو ڈبو کر کھاتا رہا۔ واپسی کب تک ہوگی؟ اس نے پوچھا۔

”چار پچھے ہنستے تو ٹرینگ میں لیجیں گے۔ پھر سیدھے اس طرف! آگے تمہارے کام پنچھرے ہے۔“

”یک دو ہی نئے میں واپس آ سکتا ہوں؟“

ذوالفقار ہبھا جیسے اس کی سادگی پر سنبھال رہا ہو۔ اس کام کا کوئی نکسہ شید دل نہیں۔ ٹرینگ کے درمیان تمہیں پٹاپٹل جائے گا۔ بہت ساری چیزوں کا اختصار حالات کے اور پر ہے۔ ہو سکتا ہے حالات ایسا رُخ اختیار کریں کہ پندرہ دن کے اندر تمہیں بلا لیا جائے۔ ہو سکتا ہے دو تین چار ہی نئے لگ جائیں۔ مگر کیک بات میں تمہیں کھل کر بتا دیں چاہتا ہوں۔ یہ کام گندہ کے پرست کے طور پر کرنے کا کوئی فائدہ نہیں۔ اگر میرا ارادہ تمہیں گردن سے کچڑا کر

ایں لبرٹ کرنے کا ہوتا تو اتنی بھی چوری بات کرنے کی ضرورت تھی۔ پہلے ہی ہمارے پاس ڈبل ایجنسٹ کیا کم ہے۔ یہ سب لوگ حرام زادے دونوں طرف سے کھاتے ہیں۔ ان کی کسی بات کا یقین نہیں کیا جاسکتا۔ جمل انفارمیشن ڈھونڈتے ڈھونڈتے اتنا وقت لگ جاتا ہے کہ وہ انفارمیشن ہی پکار ہو چکی ہوئی ہے۔ کراس چیک کرنے کے ذریعہ بہت کم ہے۔ سب یا کسی بھی تحلیل کے پڑھنے بُٹے ہیں۔ ان کو بس اپنے مال سے غرض ہے۔ ان حالات میں ایمان اور یقین سے کام کرنے والا یا کسی آدمی بھی ہمارے لیے نعمت سے کم نہیں۔ ”وہ رکا۔“ مگر ان سب ہاؤں کے باوجود اس کام کا یا کس تغصہ ہے، جب تک وہ مقصد حاصل نہیں ہو جاتا، ہمارا کام جاری رہے گا۔ تم جب آما چاہو، میسح بھیج دو۔ تمہاری واپسی کا بندراست ہو جائے گا۔ پھر موقع پڑے، پھر حلے جاؤ۔ پنجاب کا چکر لگانا چاہو تو جا کر لگا اور کسی پوائنٹ پر پسخ کر فرض کیا کہ فارغ ہونا چاہتے ہو تو اس کا انتظام بھی ہو سکتا ہے۔ دیسے بھی اس کام میں ہر آدمی کا تسلیم ٹولازیشن پوائنٹ ہوتا ہے۔ ایسی کوئی پراہنہ نہیں۔ مگر یا کسی بات میں تم پر واضح کر دینا چاہتا ہوں، کہ یہ یا کسی راست ہے، کوئی سروں وغیرہ نہیں۔ اس میں رضا مندی اور کوئی منٹ اشد ضروری ہے۔ تم جو کوئی قدم اٹھاو سوچ کر اٹھاو، کسی دباؤ یا الایک ہیں اگر مت اٹھاؤ۔

— ذوالفتار کی بات سننے سنتے اچانک اسد کے دل کے گرد وہی پُرانا، مانوس حلقة تنگ ہونے لگا۔ قدم یہ لفظ اس کے دامن میں گوشہ رہا تھا۔ قدم اچیسے ذوالفتار کی اور سب ہاں میں پیکار ہوں، صرف یہ یا کسی بات اس کے منڈ سے حکما خاصی ہوئی ہو: ”قدم اٹھاؤ۔“

— پہلی بار اسد کو اس بات کا حکم ہوا کہ ہمیشہ ہمیشہ سے وہ حالات کی میعاد کے آگے اوہر سے اوہر لالد بجا گتا رہے، کہ پسے اداے سے اپنے عمدے سے اس نے آج تک کبھی کوئی قدم نہیں اٹھایا، حالات کے اس دھارے کو روکنے کی، اس کا رُخ مورنے کی سعی نہیں کی، کہ جس وقت، جس طریقہ جس طرف بھی اس کی زندگی کے حالات نے رُخ کیا ہے، اس نے اسی رُخ پر اپنا منہ مڑایا ہے اور بے اختیار و جنبش اس طرف کو چل دیا ہے۔ اس نے زندگی سے، اس نے سرچا، کبھی مہلت حاصل نہیں کی، ہمیشہ وصول کی ہے۔ یا کس سے دُسری دُسری سے تیسری، مہلت، مہلت۔ اس نے محسوس کیا کہ غم بھرے اس کے دل کے اور بے عمل کے اس بار کا پیسا رچا جاتا رہا ہے۔ اس کے سیخے کا دباؤ بڑھا جا رہا تھا مگر ساتھ ہی ساتھ اب یہ خیال اس کے اندر جنم لے رہا تھا کہ وہ جب چاہے اس حلقوے کو توڑ سکتا ہے۔ — ہاتھ کی ایک جھٹک سے اس دھارے کی روک کر سکتا ہے۔ کہ یہ اب اس کے ہاتھ میں ہے۔ اس کا دل ہلکا ہونے لگا۔

اس نے دستِ خوان سے لمحیاں پوچھیں اور خاموشی سے پانی کا گلاس اٹھا کر منہ سے لگایا۔ گلاس خالی

کے کے اس نے دستِ خوان سے ہونٹ خشک کیکے۔ پھر اس نے سر اٹھا کر ذوالفقار کی طرف دیکھا۔ ذوالفقار نے ایک تازہ سگریٹ مکال کر پہلے سگریٹ کے گڑے سے سلاگا پا اور مکرے کو ٹین کی ایش نرے میں مسل کر زکھا دیا۔ پھر وہ کرسی کی پشت سے ٹیک لگا کر دیکھ گیا۔ کمرے کا دروازہ بند تھا اور اندر سگریٹ کا دھوکا پھیل رہا تھا۔ اس وقت ذوالفقار کو پہنچنے کرنسی پہنچتے، اطمینان سے سگریٹ کے کش لیتے ہوئے دیکھ کر اسد کے دل میں شکر اور خلوص کے چدیات لگتا آئے۔ اسے یقین تھا کہ اس کی رہائی ذوالفقار کی کوششوں کی وجہ سے ہوئی تھی۔ اسے علم نہیں تھا کہ کیوں، مگر اس کو پُر اعتماد تھا کہ ذوالفقار اس کی ہر ممکن مدد کرے گا۔ آخر اس نے یہ حمی نظرؤں سے ذوالفقار کی آنکھوں میں دیکھ کر، منزہ سے کچھ کہے بغیر، مگر گہرے عمد کے ساتھ، دوبار آہستہ آہستہ اثبات میں سر کو چاکر رضا صدی کا اظہار کیا۔

پچھے دیتک دنوں خاموش بیٹھے رہے۔ ذوالفقار کی آنکھوں میں ابھی تک ملکی سی بے یقینی کا عنصر تھا۔ سگریٹ کا ایک گہرا کش لے کر وہ آگے جھکا اور میز پر یک ہنسیاں رکھ کر بولا:

”ایک بات بتاؤ۔ تم صرف چیخ کی لڑکی کے پاس رہنے کی خاطر کام کرنے پر رضا صد ہوئے ہو چکے۔“

ایک لمحے کو اسد کے خیال میں ڈالیا کہ کیا جواب دے۔ پھر اس نے اپنے کندھوں کی خفیت سی حرکت دیتی۔ ”میری دوائی بُوقُ اُدھر سے آتی ہے۔“ وہ بولا۔

”صرف دوائی خاطر ادھر جا رہے ہو چکے۔“

اسد نے دوبارہ لا علمی کے انداز میں کندھے اچکائے۔ ذوالفقار چند لمحوں تک گہری نظرؤں سے اسے دیکھتا رہا۔ پھر بولا: ”تم خدا اور رسول پر یقین رکھتے ہو چکے۔“

اسد نے ”ہاں“ بچنے کے لیے منہ کھولا۔ ہی تھا کہ بند کر دیا۔ وہ ان سوالوں کو ایسی بہل پسندی سے حل کرنے کا خواہاں نہ تھا۔

”ایک بار پہلے بھی آپ نے پوچھا تھا۔“ اس نے کہا۔

”ہاں دوبارہ اس لیے پوچھ رہا ہوں کہ خدا اور اس کا رسول انسانوں کو انصاف اور آزادی کا حق عطا کرتے ہیں؟“

”خدا اور رسول پر تو وہ لوگ بھی یقین رکھتے ہیں جن کا ذکر ابھی آپ نے کیا ہے؟“

”ہاں۔ مگر ان کی اور تمہاری سطح میں بہت فرق ہے۔ تمہارے دل میں انصاف اور آزادی کا خبر ہے۔ یہ جذبہ یہ فخری خیال سکی جیتیت رکھتا ہے۔ صرف یہ جذبہ رکھنے والے لوگ ہی ذرع انسانی کی صحیح معنوں میں بہت

کر سکتے ہیں۔ تجھیک ہے، اس کے بعد اپنا مفہوم بھی کسی چنانک مدنظر رہا ہے۔ اس کا حق بھی، وہ دوسرا سکھڑا زمین پر پھیل کر اس سے مسلط ہوئے بولا، خدا نے ہمیں دیا ہے۔“

اسد نے دوبارہ کچھ کہنے کیلئے منڈ کھولا مگر پھر بند کر دیا۔ آفر کچھ دیر کی خاموشی کے بعد اچانک اسد کی آنکھوں میں شستیاق کی چمک پیدا ہوئی، جیسے کسی خیال نے اسے جگا دیا ہو۔ اس نے کہیاں اپنے گھنٹوں پر رکھیں اور آگے جھک کر بیٹھ گیا۔

— ”آپ کو، اس نے پوچھا، ”یرہی بے گناہی کا تیعنی ہے ہے؟“

ذوالغفار نے چونک کر اس کی طرف دیکھا، جیسے اس سے کوئی غیر مناسب سوال پوچھ لیا گیا ہو۔

”قصور اور بے قصوری کا معاملہ خدا کی ملکیت میں ہے۔ پھر وہ بولا، یہی جیسے ہی جیسے سزا اور جزا کا اختیار اس کے پاس ہے۔ پھر ان بالفاظ پر سوال اٹھنے کا کیا فائدہ ہے ہمارا معاملہ اپنے قانون سے ہے۔ قانون کی نظر میں تم بے گناہ ہو تو بے گناہ ہو۔ اس سے آگے ہم نہیں جان سکتے نہ اس سے آگے جانتے کا، ہمیں کوئی حق ہے چنانچہ اس سوال پر مزید سوچ کا صرف بے شود ہے۔“

اسد کی نظروں کے ملنے سے شک و ثیر کے بھوت نے اپنا بڑا سایاہ گنجائک سر اٹھانا شروع کیا اور اس کے دل میں ایک تھیم، سلگتی ہوئی، بے اطمینانی پیدا ہوئی۔ مگر یہ باقیں اب اس کے راستے میں حائل نہ ہو سکتی تھیں اب وہ ایک نشے کی بے خیال میں تھا۔ وہ ایک نلا پuch بھر کر ان چھوٹی بڑی میلتوں کے حلقوں سے نکل گیا تھا۔ اس وقت جس کام کا ذرہ اس نے یا تھا وہ کام بھی اس کے خیال میں نہ تھا۔ اس وقت اس کی نظروں کے سامنے مستقبل کا ایک منظر تھا۔ گُند کے اندر وہ یا سیم کے پاس بیٹھا ہے، ہمیں بیٹھا ہے، چل پھر رہا ہے، اور ہر کام سے فارغ ہے۔



سب سے شکل کام جو اسے درپیش تھا یا سیم سے نہیں سے نہیں کا تھا۔ آدمی رات تک تم غائب ہو گئے کچھ باتے بغیر، کوئی بات یکے بغیر نہیں یہاں رکھ دی جائے حال ہرگئی۔ تمہیں میرا کچھ خیال نہیں ہے وہ برا

اسد سے بستھا رکتی، ”ذوالفقار کے پاس قم کیا کرنے گئے تھے بہجھے تو اس کی شکل سے نفرت ہے۔ اُدھی
رات کے وقت کیا کرنے گئے تھے؟ بنا تے کیوں نہیں؟“

دو دن تک وہ اسے مانتا رہا۔ جیکے بہلنے سے خوش مذاقی سے، سُنی ان سُنی کر کر کے — اُس کو دو روز کی مہلت مل تھی، مگر وقت اب اس کے قابو میں تھا۔ اس شکلِ نوبت کے زیر زیر اسکو احساسِ بخاک وہ جو چاہے اپنے ساتھ، یا سین کے ساتھ، اپنے مشترک حالات کے ساتھ کر سکتا ہے، کہ اب یہ اس کے اختیار میں ہے۔ واقعات کی روکو اس نے پنجے میں جکڑ لیا تھا۔

پہنچی مشکل کا احساس اُسے اُس وقت ہوا تھا جب اُس رات کو گھر لوٹ کر اُس نے وفات دروانے پر نظر دالی تھی۔ اُو حیرت کا وقت تھا اور اُس مقبرے کے سے بے نظر و صوت گاؤں میں صرف ایک اپنے کی صورت را تھا، اور اُس کے درمیان پائیں کا آڑے آڑے بالوں والا پاگھل چہرہ معلق تھا، جیسے جسم سے کٹ چکا ہو۔ وہ بتی پنجی کیے، لا لیٹن ہاتھ میں لٹکائے دروانے کے اندر، یعنی سی شاخ کی ماں، سنبھل کر گھر تھی۔ اُس کا اُپر کا دھڑ نسبتاً اندھیرے میں تھا، اور اُس اندھیرے میں اُس کا چہرہ دُولتا ہوا دکھائی دے رہا تھا۔ اس نے قریب ہاگر دیکھا کر دہ بے حرکت کھڑی تھی اور اُس کی انگھوں میں طویل جدافی کی خشکی اور سوزش تھی۔ دو روز تک وہ سختے سے صبر سے ہٹکے اور جوش سے جاب طلب کرنے رہی اور دو روز تک اسدا پسندے درد کے کوز اور کناروں پر با تھاد کر کر انہیں گولاٹیوں میں دھاندا، ان کی کاٹ کر گزانتے کی سی کنواری۔ اب یہ رات بیج میں تھی اور پائیں کے درد سے معاملہ لئے کرنا بھی باقی تھا۔ اس کی مدت دہ اپنے میں نہ پا رہا تھا۔

اُس نے دبے لفظوں میں، سرسری لجھے میں داسین کو اپنے فیصلے کے باسے ہے میں تباہ چالا۔ یادسین کی
واز و حشت سے گوشخ انٹھی:

کہاں کبھی کسی حکمیتی دوپکیے جائے ہو۔ ذوق الفخار کے ساتھ جائے ہو۔

”خدا غفار کے ساتھ نہیں چارا میں“ اس نے کہا، ”اس نے انتظام کیا ہے؟“

”کیا انتظام کیا ہے؟“ دو الفقد کی شکل سے مجھے فترت ہے۔ اُس کی نیولے کی مار آنکھیں ہیں دیکھتے ہی مجھے خون آنے لگا تھا۔ مجھے علم تھا یہ کہنے شر پیدا کرے گا۔ وہ تمہارے جد نے کا انتظام کر سکتا ہے، بُوئی مگرانے کا انتظام نہیں کر سکتا ہے تمہیں جانے کی کیا ضرورت ہے؟“

"دیکھنے بجانٹنے کی کیا ضرورت ہے۔ بچھے معلوم ہے یہ کیا چیز ہے، میں نے رسوں تک استعمال کی ہے۔

اُس ادمی سے جاکر تم نے کیروں پوچھا ہے ہے میں تمہیں منگرا دوں گی ۔

”خوشی محمد جبیل میں ہے تم کیسے منگوا دوگی ہے؟“

”جیسے بھی منگرا دوں تمہیں اس سے کیا عرض تمہیں دوائے عرض ہے دوائے عرض مل جائے گی ۔“

اسد خاموش ہو رہا ۔

”تم مجھ سے کچھ چھپا رہے ہو، اسد۔ کیا بات ہے؟ چمک تھیک کیوں نہیں بتاتے۔ کہاں جا سہے

ہو رہا ۔

”میں سرحد پار جا رہا ہوں۔“ اسد نے صبر سے کہا، ”صرف ایک بھینی کے لیے کوئی زیادہ ہر صورت کے پلے نہیں۔ ایک ماہ کے لیے واپس آجائیں گا۔“

”ذوالفقار نے کیسے انعام کیا ہے؟ پولیس کے ذمیعے ہے؟“

”پولیس سے ذوالفقار کا کوئی تعلق نہیں۔“

”پھر کس سے ہے؟“

”شاید فوج سے ہے؟“

یاسین نے دل کر پوچھا: ”فوج میں بھرتی ہو کر جا رہے ہو؟“

اسد ہنسا: ”فوج میں تو بھرتی نہیں ہو سکتا۔ سانس تھیک نہیں۔“

”پھر؟ پھر کسے جا رہے ہو؟“

”پرائیویٹ طور سے جا رہا ہوں۔ ازادی سے جب چاہرے واپس آسکتا ہوں کوئی بندش نہیں۔“

ذوالفقار کی اس عملیے میں بہتر ہے۔ میں نے خود اس سے کہا ہے۔“

”تم نے خود چھپا کر پوچھا۔“ میں نے آنکھیں پھیلا کر پوچھا۔ ”میں ہی بھیٹھے بھیٹھے ہو مجھ سے بات کیسے بغیر اٹھ کر

ایک دوسرے ملک کر جا رہے ہو؟“ وادہ۔“

”کوئی دوسرا ملک تو نہیں۔“

”اور کیا ہے۔ دوسری حکومت تو ہے۔“

”حکومت سے کیا ہزما ہے؟“

”ذرجا کر دکھاؤ۔ پتا چل جائے گا حکومت سے کیا ہزما ہے؟“

”تمہارے سب لوگ ادھر سے اُھر آتے جاتے رہتے ہیں۔ کیا فرق پڑتا ہے؟“

”ہمیں نہیں پڑتا۔ ہماری بولی، باتِ حریت، درشتے داریاں سب ایک ہیں۔ تمہیں پڑتا ہے۔“

”میرے لیے تو پھر یہ بھی غیر ملک ہے۔“

”تم ادھر سے پڑھ گئے تو ادھر کو پڑھے جاؤ گے۔ ادھر سے پڑھ گئے تو ادھر والے۔۔۔“

”ادھر نہیں پکڑا جاؤ گا۔“

یاسین نے بھیسے اُس کی بات سننا چھوڑ دی تھی۔ وہ اٹھ کر بستر پر بیٹھ گئی۔ اُس کی لپشت پر رنگٹے کھڑے تھے، اور اُس کے کندھوں میں خفیہ سی کپکا ہٹ تھی۔

”میراں دوب رہے۔“ وہ لرزتی ہوئی کمزور اداز میں بولی۔

اسد نے اُس کی کمر میں ہاتھ ڈال کر کھینچا۔ وہ اپنی جگہ پہنچھی رہی۔ تمہارے پکڑے جانے کا خیال کر کے میراں دوبنے لگتا ہے۔

اسد نے دونوں ہاتھ اُس کے کندھوں پر رکھ کر اُسے ڈال دیا۔ پا گھلوں کی سی باتیں مت کرو۔ میں کوئی پکڑا دکڑا نہیں جاؤں گا۔ تم لوگوں کی طرح دکھائی دیتا ہوں، بول دیتا ہوں، کوئی پہچان نہیں سکتا۔ پھر فدا الفقار کے جانتے والے ادھر ہیں۔ میں ان کی حفاظت میں رہوں گا۔ کبھی خطرے کا امکان نہیں۔ مخنوڑے سے وقت کی بات ہے۔ تم خواہ مخواہ گھبرا رہی ہو۔“

”خواہ مخواہ! تم جاکیوں رہے ہو مجھے چھوڑ کر چکیا خودرت ہے ہے۔“

”اس کے جواب دینے سے پہلے وہ پھر بولی۔“ فدا الفقار کا کیا مطلب ہے اس میں ہے۔

”ضروری ہے کہ اُس کا مطلب ہو چکا۔“

”اُن۔ ایسی شکل والا آدمی اپنے مطلب کا آدمی ہوتا ہے۔“

”سمری سا کام میرے ذمے اُس نے لگایا ہے۔“

”کیسا کام ہے؟“

”کچھ خبر رسانی وغیرہ کا کام۔“

”خبر رسانی ہے یعنی جاسوسی کا کام ہے جاسوس بن کر جا رہے ہو چکا۔“

”جاسوسی تو بہت بڑا کام ہے۔ چونکہ میں جا ہی رہا ہوں اُس نے کہا ہے کہ اپنا کام ختم کر کے جب واپس آؤں تو اس کے عام حالات سے باخبر کر دوں۔ راشے عاصہ وغیرہ وغیرہ مدد بھی کوئی پابندی نہیں۔ جب چاہوں واپس آسکتا ہوں۔ کوئی روک نہ کر۔“

”تم خواہ مخواہ گھبرا رہی ہو۔“

یاسین نے کہا کہ اٹھنے کی کوشش کی مگر اسد کے ہاتھوں کے دبار ملے لیٹی رہی۔ اسد کا ایک اخراجی کے پیٹ پر رکھا سانس کی ورکت کے ساتھ لرز راتھا۔ یاسین کی جلد سے آگ بخل رہی تھی۔ اس کے درد کے کوارٹر اس نے سوچا، میرے ہاتھوں سے باہر ہیں۔

”تمہاری بات میری سمجھنے میں نہیں آتی۔“ یاسین کا ہجھ دفعہ دھما پر گیا، جیسے اسد کی بات کو کبھی نہ کہ جائے سمجھنا چاہ رہی ہو۔

”کیوں ہے سیدھی سی بات ہے؟“

”تمہاری کوئی بات، وہ بولا،“ میری سمجھنے میں نہیں آتی۔“

اسد خاموش لیتا، ہاتھ پر یاسین کے پیٹ کے تلاطم پر رکھتے، آخر اس کے سوال کی تہہ کو پہنچ گیا۔

”اسی لیے جا رہا ہوں۔“ وہ بولا۔

”کیوں ہے؟“ یاسین نے ہاتھ سے پوچھا۔

”کہ تمہارے پاس رہ سکوں۔ تمہارے ساتھ بات کر سکوں۔“

”جانے سے کیا ہو گا؟“

”تمہارے پاس رہنے کی آزادی مل جائے گی۔“

”اسدی؟“ وہ بھر کر اٹھی۔ ”تم آزاد ہو۔ تم اب —“

مگر اس نے ہاتھ انداز کر اسے خاموش کر دیا۔ میری زندگی، وہ بولا، ایک طویل قید ملتی جا رہی ہے۔ کرنی تھا اس تو آزادی حاصل ہو۔ پھر تمہیں بھی میری بات کی کوئی سمجھوتے۔“

”اگر چھوڑ کر جانے سے بھی آزادی ملتی ہے تو ایسی آزادی کا کیا فائدہ ہے کوئی بات اتنی اہم نہیں کہ اس کے لیے تم مجھے چھوڑ کر ہی چلے جاؤ۔“ اس کی آواز میں انسوؤں کی نئے سرایت کر آئی تھی مگر اس کی آنکھیں صحراؤں کی طرح بھیلی ہرلی اور خشک تھیں۔

”ایک بار تو جانا ہی پڑے گا۔“ اس نے کہا۔

”کیوں ہے؟“

”اس کے بغیر حاضر نہیں۔“ وہ بولا، ”میرے اپنے لیے بھی یہ بات اہم ہے۔“

”یہ جانتے ہوئے بھی کہ تمہارے جانے سے میری سمجھے بھی چل جائے گی؟“ پھر بھی تمہارے لیے یہ بات

اہم ہے۔“ اس نے بات ختم کر دی۔

"اے، پر کھو دیر کے بعد اس نے جواب دیا۔

"پھر تم سورتوں کو کہاں جانتے ہو؟ یا سہیں بولی، مردوں والی بات کرتے ہو؟"

"یکے پہلے"

"اپنی اہمیتیں کو حاصل جان کر سمجھتے ہو کہ میرے کام بھی سیدھے ہر جائیں گے مگر اپنی بات کو میری بات سے کبھی نہیں ملتے۔ اپنی سوچ سوچتے ہو اور مجھے دلاسا دیتے جو بھی بات تو میری سمجھیں نہیں آتی۔ تھیں پہاڑے کے بعد میرا دل نہ ہو جاتا ہے ہب جب تم پر میں کی قیاد میں ملتے تو میری انھیں اندر میرے میں دیکھنے کے قابل ہو گئی تھیں، چمگا کا دروں کی طرح بیٹیں رات بھر انھیں کھوئے ویکھتی رہتی تھی اور میرے دل میں کوئی خیال بھی نہ آیا تھا۔ میں کوشش کرتی تھی اپنے بچپن کی کوئی بات یاد آئئے، پتا چلے کہ نہیں زندہ ہوں۔ مگر ایک بات بھی یاد نہ آتی تھی۔ میرا حافظہ بخوبی پتا تھا، ایسی حیران کر دینے والی بات تھا۔ میرا انھیں کیسے آئئے گی میرا پہلی، اس نے ایک خشک سسکی بھری، "سوکھ گیا تھا۔"

اس نے دلوں ماخبوں سے اس کا چہرہ تھا، جیسے کاپن کے گلدان کو اٹھا رہا ہو، اور آہستہ سے اپنے سینے پر رکھ لیا۔ ایک کھیت میں ایک جھاڑی ہے، اس جھاڑی پر ایک سرخ پھول ہے، اس کے ذہن سے گزرا، اور ہوا زدہ سے چل رہی ہے۔ وہ دیکھ کر ایک گال اس کے سینے پر رکھے اپنی بے جھپک انھیں سے دیوار کے اندر میرے کو دیکھتی رہی۔ اس کا طوفان آہستہ آہستہ سر دپتا گیا۔ اس کی صیبی ہوتی ہوئی سانس کی رفتار سے اس کو اس کی روت پھوٹ اور پھر اس کی قوت کا اندازہ ہوا۔ رات کی ہر اکھڑی کے راستے کمرے میں آ رہی تھی۔ اس نے پادر سے اپنے آپ کو اور یا سہیں کو دھانپ لیا، چادر کے اندر بھی یا سہیں کی انھیں کھلی رہیں، اس پھرے کرنا تھا۔ اس میں یہ اس بے آواز بات میں اس کو ایک ایسے درد کا حسکس ہوا جس سے اس کا دل اشناز تھا۔ تیرت سے اس نے سوچا کہ وہ اس درد سے اشناہوئے کا خواب بھی نہ تھا، کیونکہ اسی لمحے اس کو ایک عجیب سی سرزنشی اور توانائی کا احساس بھی تھا۔ دل کے اس درجہ متنہاد زگوں نے اس کے فہم کر پچھاڑ کے لکھ دیا تھا۔ وہ وقت کو تھی میں یہ پھر لپنے آپ کو اسی وقت کے حوالے کیے، چت پڑا چھت کو دیکھتا رہا، اندر میرا کئی برس پر محیط تھا۔

دیر کے بعد یا سہیں نے سرداراً اٹھایا۔ قم میں سال کے جو گئے ہو، اس نے کہا۔

اس نے چونکے کر یاد کیا کہ اس کی بیسویں سا گرد تھی۔ تھیں کیسے پتا ہے؟ اس نے پوچھا

"تم نے ایک پار بتایا تھا۔"